ابلیس کی مجلس شوریٰ از اقبال

مابعد نوآبادیاتی مطالعہ

ڈاکٹر راحیلہ لطیف
لیکچرار اردو
گورنمنٹ سید چراغ شاہ ڈگری کالج، قصور

IQBAL'S IBLEES KI MAJLIS SHURA
A POST COLONIAL STUDY

Raheela Latif, PhD
Lecturer in Urdu
Govt Syed Chiragh Shah Degree College, Kasur

Abstract

The post colonial theory discovers the urge in the colonized natives to realize the effects of colonialism and respond to it in order to protect their social and cultural sovereignty. Allama Iqbal, the leading poet and philosopher of the colonial era in sub-continent, penetrated deeply into the conditions of that time and raised the voice of the subaltern people in his poetry. This article aims at examining Iqbal's famous poem Iblees ki Majlis e Shura with reference to the post colonial theory.

Keywords:
ابلیس، مجلسِ شوریٰ، مابعد نوآبادیات، سرمایہ داری نظام، فاشزم، اشتراکیت، مذہبی شناخت، مغربی تہذیب، جدیدیت

مابعد نوآبادیاتی فلسفے کے تحت نوآبادیات اور شہنشاہیت کا ثقافتی ورثہ نیا اثبات، وضاحت اور تجزیہ چاہتا ہے۔یہ استعمارزدوں اور استعمارکاروں کے معاشی، علمی اور تمدنی استحصال کے اثرات کا مطالعہ ہے۔نوآبادی کے باشندوں کے شہری حقوق، تعلیم اور سماجی شناخت کے تمام وسائل نوآبادکاروں کی سلطنت کے تحفظ اور استحکام کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔یہ فلسفہ، زبان، شناخت اور معیشت کے اپنے بیانیے ترتیب دیتا ہے اور ان بیانیوں کے ذریعے نوآبادی اور نوآبادکاروں کے درمیان تعلق کی تفہیم کی کوشش کرتا ہے۔مابعد نوآبادیاتی نظریہ نوآبادیوں کے باشندوں میں بیدار ہونے والی اپنی سماجی اور ثقافتی سلیت کی حفاظت کی خواہش کے تحت نوآبادیات کے اثرات اور ردعمل کا مطالعہ پیش کرتا ہے۔اقبال جیسے نباض عصر مفکر نے اپنی وفات سے دو برس قبل لکھی گئی اپنی آخری طویل نظم ابلیس کی مجلس شوریٰ میں نوآبادیاتی استعماری نظام کی ہلچل کی بھرپور عکاسی کی ہے۔یورپی استعمار نے برعظیم پاک وہند کی ہزاروں برسوں پر محیط سیاسی، معاشی اور انسان دوستی پر مبنی قومی روایات اور استعمارزدہ خودی کو تعلیم کے تیزاب میں ڈال کر جدھر چاہا پھیرا تو یورپی تہذیب آفاقی اور یورپی زبان علم کا معیار قرار پائی۔ کسی زندہ سماج کی تین بڑی بنیادوں یعنی انسانیت دوست فکر، پرامن سیاسی نظام اور خوش حال اقتصادی نظام کو برطانوی سامراج نے اپنی نوآبادیوں خاص طور پر برعظیم میں اپنے کیبری بیانیے کے ذریعے مسمار کر کے رکھ دیا جس سے اس معاشرے کے لوگوں کو اجڈ، جاہل، وحشی اور غیر مہذب ثابت کیا گیا۔لارڈ میکالے حکومت ''خود اختیاری'' میں کہتا ہے:

> ''زمانہ سابق میں جس طرح زور دار اور بااثر لوگوں کو افیون کے پوست پلا کر کاہل، پست ہمت اور بدعقل بنا دیا جاتا تھا، ہمارا نظام سلطنت اسی طرح اہل ہند کو بے کار کر دے گا۔''(۱)

مسٹر لڈلو اپنی کتاب ''برٹش انڈیا'' میں لکھتا ہے:

> ''انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان فتح ہونے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بجائے اُبھرنے کے اس کے تمام باشندے ذلیل ترین ہو جائیں گے۔''(۲)

برطانوی سامراج کی اس سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے نتیجے میں ہندوستانی معاشرے کی ترقی رک گئی اور بتدریج زوال آمادہ ہوا کیونکہ

ع غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اقبال کی آواز نوآبادیاتی دور کے لکھنے والوں میں نہایت توانا اور منفرد ہے۔خاص طور پر ابلیس کی مجلس شوریٰ میں استعمارکار سامراج کے افکار کی نشاندہی جس بلند آہنگ لہجے میں کی گئی ہے وہ فقید المثال ہے۔ ارمغان حجاز میں شامل اقبال کی اس آخری طویل نظم کو ان کے مسلسل ارتقاپذیر فن کا ماحصل بھی کہا جا سکتا ہے۔

پندرہویں صدی عیسوی سے برصغیر میں وارد ہونے والے یورپی سیاحوں کی اپنی پارلیمان میں پیش کردہ رپورٹیں بتاتی ہیں کہ برصغیر ایک ایسا علاقہ ہے جہاں اعلیٰ تمدن اور پرشکوہ ترقی موجود ہے۔بہت سے فرقے

ہونے کے باوجود وہاں معاشرتی وحدت حیرت انگیز ہے جس کی بنیادی روح ان کا نظامِ تعلیم ہے۔یعنی ہندوستان میں وہ فلسفہ موجود تھا جس کی اساس وحدتِ انسانیت پر تھی جس کے نتیجے میں یہاں معاشی خوشحالی اور سیاسی امن موجود تھا۔چنانچہ اٹھارویں صدی عیسوی میں یورپ نے برصغیر میں اپنا تسلط قائم کرنے کی حکمت عملی کا آغاز کیا اور اس کے لیے جو فکر مرتب کیا، وہ وحدت کی جگہ تقسیم، امن کی جگہ انارکی، خوشحالی کی جگہ بدحالی اور لوٹ مار کو بنایا۔انھی منافقانہ نظریات کے ساتھ وہ برصغیر میں آئے اور یہاں کی سیاست اور معیشت کو تباہ کیا اور آخر میں اپنے تقسیم انسانیت کے فلسفے کو پوری نوآبادی میں لاگو کر دیا۔ابلیس کی مجلس شوریٰ بھی دراصل سامراج کی اس انسانیت سوز فکر اور حکمت عملی کا براہِ راست تنقیدی جائزہ پیش کرتی ہے۔بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی:

> ''دنیا کے مختلف نظاموں کی طرح، ابلیسیت کو بھی ایک مستقل نظام کی حیثیت حاصل ہے۔اس نظامِ فکر کا سرچشمہ ابلیس کی ذات ہے۔یہ نظام محض فکر تک محدود نہیں، بلکہ دنیا کو اپنے فکر کے تابع رکھنے اور عملاً اپنے فکر کے فروغ و ترویج کے لیے ابلیس نے سیادت و حکمرانی کے اصول وقوانین وضع کر رکھے ہیں۔''(۳)

یہاں ابلیس گویا نوآبادیاتی طاقتوں کے نظم و ضبط، عزائم، تحرک اور عملِ پیہم کا استعارہ ہے۔یورپی استعماری طاقتیں تکبر اور سرکشی کے نشے میں دھت دوسری جنگ عظیم کی تیاریوں میں تھیں۔فساد فی الارض اپنی عبرت ناک شکل میں یورپی قوم پرستی کا لبادہ اوڑھے کہیں ہٹلر کے نازی ازم کا روپ دھارے ہوئے تھا تو کہیں مسولینی کا فاشزم اطالویوں کو لڑائی کے لیے تیار کر رہا تھا۔اشتراکیت کے انقلابی اثرات روس سے باہر تک پھیل چکے تھے۔یوں اقوام یورپ ابلیسی نظام کے استحکام کی مکمل تصویر پیش کر رہی تھیں جو اپنی نوآبادیوں میں اپنی طرز کی ایک نئی دنیا پیدا اور مسخر کرنے کے نہایت ولولہ خیز اور پرشکوہ تصور سے معمور تھا۔استعماریت کی علامت یہ ابلیسی نظام جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری سے استعمارزدوں کی نظروں کو خیرہ کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہو چکا تھا اور بہ قول ایڈورڈ سعید ''یورپی ثقافت، مشرق کو سیاسی، عمرانیاتی، عسکری، نظریاتی، سائنسی اور تخیلی طور پر زیر انتظام لانے اور پیدا کرنے کے قابل''(۴) ہو چکی تھی۔

''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کے پہلے بند میں ابلیس اپنے افتتاحی خطاب میں استعماریت کی غلبے کی خواہش کو بھی اپنا کارنامہ قرار دیتا ہے۔جب وہ کہتا ہے:

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب
میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا
میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

مل اشرافت کے مطابق نوآبادیات اپنی ابتدائی صورت میں سرمایہ داری نظام کی پروردہ تھی۔

لہٰذا نوآبادکاروں نے اپنے ایشیائی اور افریقی کالونیوں کے خام مواد، سرمائے اور دیگر پیداواری وسائل کو اپنی زمینوں میں منتقل کیا اور اپنے محکوموں سے سیاسی، ثقافتی اور سماجی فاصلہ قائم رکھا۔(۵)

اس سے فساد فی الارض کی جو صورت پیدا ہوئی ابلیس اسے اپنی فتح سمجھتا ہے۔ کیونکہ نظم کے آغاز میں ابلیس کی تمہیدی سطور کے بعد پہلا شعر اسی جانب توجہ دلاتا ہے کہ ابلیسی نظام بلاشبہ محکم ہے اور اس نظام کے نوآبادکاروں نے اپنے نام نہاد اصلاحی، تہذیبی، احیاپسندی اور تقسیم کے مختلف بیانیوں سے استعمارزدوں کو خوئے غلامی میں پختہ تر کرلیا ہے۔ ان کے افکار داخلی اور باطنی آزادی سے محروم نوآبادیاتی بیانیوں کے سائے تلے پروان چڑھتے ہیں۔ صدیوں تک ایک سرزمین پر رہنے والوں میں تفرقہ ڈال کر انھیں مذہبی لسانی مناقشات میں گھسیٹنے کے لیے ابلیسی استعماری نظام نے ایسے مقامی افراد پیدا کیے جن کے متون نے عوام کی ذہن سازی کی۔ مجبور، مظلوم اور محکوم و مقہور لوگوں کو ملوکیت کا بندہ بناڈالا۔ استعماری ایجنٹ کہتا ہے:

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام
یہ ہماری سعی پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

بھگتی کے گیت گانے اور ہندوستان کو سارے جہاں سے اچھا کہنے والے اقبال پہلے مشیر کی زبانی صرف ملی حوالے سے بات کرتے ہوئے مسلم ذہنیت کو سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ اقبال کی ذہنی ساخت پر ان کے عہد کے تاریخی، سیاسی، تہذیبی اور عمرانی پس منظر کے اثرات نے یہ واضح کردیا تھا کہ برعظیم کے مسلمانوں کے زوال کی بنیادی وجہ مسلمان قوم کی بے عملی اور قنوطیت تھی جس نے ان میں سے زندگی کا احساس زائل کردیا تھا۔ اقبال نے اس مردہ قوم کو جلا بخشی اور لاہور سے تا خاک بخارا و سمرقند دلوں کو تازہ ولولہ دیا۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> ''جس قوم کو آرام و آسائش کی زندگی حاصل ہو اور اس کا دل آرزو کی خلش سے محروم ہو، وہ بہت جلد کسی قوی نظریہ رکھنے والی تازہ دم قوم کا شکار بن جاتی ہے۔ اس تاریخی حقیقت کو اقبال نے بار بار اپنے کلام میں بیان کیا ہے۔''(۶)

مومن کی تیغ بے نیام کا کند ہو جانا سرسید اور مولوی چراغ علی مرحومین کے تصورِ تنسیخ جہاد کی طرف اشارہ ہے۔ اصل میں سرسید اور اقبال دونوں مفکرین نوآبادیاتی دور کی پیدا کردہ نظریاتی کشمکش میں توازن کے حصول کی کاوش کرتے نظر آتے ہیں۔

سرسیّد براہِ راست نوآبادیاتی بیانیے کو قبول کرتے ہیں، جبکہ اقبال ''تقسیم کرو، حکومت کرو'' کے استعماری بیانیے سے اثر پذیر ہو کر وطن پرستی کا بت توڑ کر سارا جہاں ہمارا کے نغمے گانے لگتے ہیں۔ ایسا جہاں جو مکمل طور پر تہذیب یافتہ اور کامل انسان کی پرداخت کرسکے۔ آلِ احمد سرور لکھتے ہیں:

''اقبال نے اپنے فلسفے اور فن کے ذریعے سے ہماری نو آبادیاتی دور کی مغرب پرستی، مذہب سے بیگانگی اور مغرب سے مرعوبیت کے خلاف جہاد کیا۔ وہ ارتقا، تغیر، تبدیلی پر اسی طرح ایمان رکھتے تھے جس طرح تسلسل پر۔ انھیں کسی طرح قدامت پرست نہیں کہا جا سکتا۔''(۷)

دوسرا مشیر پہلے مشیر کی توجہ دورِ جدید کے نئے مسئلے یعنی جمہوریت کی طرف مبذول کراتا ہے کہ عوام پر عوام کی حکومت استعمار کے لیے لمحہ فکریہ ہے لیکن پہلا مشیر اسے تسلی دیتے ہوئے کہتا ہے:

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

لیکن پہلا مشیر جمہوریت کو ملوکیت کا پردہ قرار دیتے ہوئے اس ''دیوِ استبداد'' کو ابلیسی نظام ہی کا شاخسانہ قرار دیتا ہے۔ ابلیس اس نو آبادیاتی دور میں ہمیں اقبال کے ہاں ایک سرگرم سیاست داں کے طور پر متحرک اور فعال نظر آتا ہے۔ نظم ''ابلیس کی عرض داشت'' میں وہ کہتے ہیں:

جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہ افلاک

چونکہ دورِ جدید کا آدم ''خودشناس وخودنگر'' ہو چکا ہے تو اس کے اطمینان کے لیے شہنشاہیت کو جمہوریت کا لباس پہنا کر نو آبادیاتی تسلط کے ذریعے کمزور قوموں کا معاشی اور ثقافتی استحصال جاری وساری ہے۔ مغرب کے سرمایہ دارانہ ممالک اور مرحوم سوویت یونین سب جمہوریت کے علمبردار ہیں۔

تیسرا مشیر تیزی سے قبول عام حاصل کرنے والی اشتراکیت کی تحریک کی جانب سب کی توجہ مبذول کرواتا ہے لیکن چوتھے مشیر کے خیال میں مسولینی کی فسطائی تحریک اشتراکیت کے زہر کا تریاق ثابت ہو سکتی ہے، جبکہ تیسرا مشیر مسولینی کی عاقبت بینی کا قائل نہیں، کیونکہ ۱۹۳۵ء میں حبشہ پر حملہ کر کے اس نے استعماریت کی روایت کو استحکام بخشتے ہوئے رائے عامہ کو اپنے خلاف کر لیا تھا۔

پانچواں مشیر استعماریت کی جامع علامت ''ابلیس'' کی تعریف وتوصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا ہے۔ یاد رہے کہ خودپسندی، استکبار اور احساس برتری نو آبادکاروں کی تہذیب کی اساس ہے۔ ابلہ جنت اور سادہ دل بندے وہ استعمار زدہ عوام ہیں جو استعمارکاروں کے بیانیوں کے زیرِ سایہ اپنی ذہنی اور فکری زندگی کا ہیولا وضع کرتے ہیں۔

پانچویں مشیر کے خیال میں افرنگ کے ساحر اگرچہ ابلیس کے پیروکار ہیں لیکن ان کی فراست اب لائق اعتنا نہیں ہے، کیونکہ ان سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور بادشاہوں نے تا حال اشتراکی خطرے کا ادراک نہیں کیا۔

پانچویں مشیر کے برعکس ابلیس اپنے دست تصرف اور "ایک ہو" سے سب کو دیوانہ بنا دینے کے دعوے کے ساتھ اس احتمال کو رد کرتا ہے کہ اشتراکیت ابلیسیت یا استعماریت کے لیے فتنہ ثابت ہو سکتی ہے:

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مو

ابلیس کی یہ وضاحت قابل غور ہے:

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمت سے ہے
اس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

مابعد نوآبادیات کا ادبی نظریہ نوآبادیاتی ادب کا مطالعہ اس سماجی کلامیے کی رو سے کرتا ہے جو استعمار کاروں، استعمار زدوں کے مابین تشکیل پاتا ہے۔ ۱۸۲۱ میں کارنے ٹیکس نے ایشیاٹک جنرل میں لکھا تھا کہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" رومن کا مقولہ ہماری ہندوستانی حکومت کا اصل اصول ہونا چاہیے۔(۸)

۱۹۳۶ء میں جب یہ نظم لکھی گئی تب تک اقبال قومی حسیت کو بہت پیچھے چھوڑ کر ملی حمیت میں گم ہو چکے تھے۔ بہ قول ڈاکٹر ناصر عباس نیر:

"..... (حالی کی نظم) "شکوۂ ہند" میں اس امر پر اصرار صاف محسوس ہوتا ہے کہ "آب و ہوائے ہند" نے مسلمانوں کو جب ہر جوہر سے معرا کیا تو اس "اصل" سے بھی دور کر دیا اور وہ قومی اور جغرافیائی شناخت کے اسیر ہو گئے۔ مسلمانوں کی یہ شناخت بیسویں صدی میں ملت کے اس تصور میں اپنی پوری قوت سے ظاہر ہوئی جسے اقبال نے پیش کیا۔"(۹)

زیر بحث نظم میں اُمت مسلمہ سے خوفزدہ ابلیس اس بات سے تو مطمئن ہے کہ بندۂ مومن سرمایہ داری کو اپنا دین بنا کر سودی نظام کے تحت اللہ اور رسولؐ کے ساتھ اعلانِ جنگ کر چکا ہے اور مذہبی راہ نما روحانی قوت سے عاری ہیں لیکن خدشہ یہ ہے کہ شرارِ آرزو کسی بھی وقت شعلہ جوالہ بن سکتا ہے، کیونکہ آئین پیغمبر حافظِ ناموس زن، مرد آزما اور مرد آفریں ہے۔ یہی آئین ابلیسی نظام کے لیے خطرہ بھی ہے اور ردِ استعماریت کا اعلان بھی۔

نوآبادکاروں نے مشینی ایجادات اور صنعتی و مادی عروج کے بل پر نوآبادیوں کو مرعوب و محکوم تو بنا رکھا تھا لیکن پہلی جنگ عظیم کی قتل و غارت گری کے بعد جہاں انھوں نے یورپ کی بعض مشرقی ریاستوں کو مسلمانوں سے زبردستی چھین لیا، ایران، ترکی اور فلسطین کی گردنوں پر اپنی گرفت مضبوط کر دی وہیں اپنے مکروہ اعمال اور استحصال پر منافقت کا پردہ ڈالنے کے لیے لیگ آف نیشنز کا سنگ بنیاد رکھا جس میں اقوام عالم کو شریک کر کے یہ تاثر دیا گیا کہ دو قوموں میں اختلاف کی صورت میں یہ ادارہ دادرسی کرے گا۔ اقبال کی نگاہ رسا نوآبادکاروں کی اس چال کے بارے میں پیشین گوئی کرتی ہے:

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبر بد، مرے منہ سے نہ نکل جائے

تقدیر نو مبرم نظر آتی ہے ولیکن
پیرانِ کلیسا کی دعا یہی ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتہ پیرکِ افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

اس حوالے سے سیرت اقبال کے مصنف محمد طاہر فاروقی لکھتے ہیں کہ اقبال نے اس امر کا اظہار بھی کیا کہ ایسی کوئی انجمن جس میں جنس، رنگ، نسل اور وطن کے امتیازات برقرار رکھے جائیں اقوام میں باہمی وحدت پیدا کرنے کا سبب نہیں بن سکتی۔(۱۰)

تفریق ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم
مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم

لہٰذا ابلیس کی مجلس شوریٰ میں ردِ استعماریت کا اعلان کرنے اور جمعیت آدم کا پیغام دینے والے اسلام کو ہی ابلیس اپنے لیے حقیقی خطرہ قرار دیتا ہے اور اس سے نپٹنے کے لیے ابلیس اپنے آلہ کار نمائندوں کو آئندہ کے لائحہ عمل سے آگاہ کرتا ہے۔اس کے مطابق استعماریت کا جال اسی صورت مضبوط رہ سکتا ہے جب ملت اسلامیہ کے افراد بدستور استعماری بیانیوں کی پیدا کردہ بے حسی، غفلت اور بے شعوری کے دام میں اُلجھے رہیں۔صرف عبادات کی رسوم نبھانے والوں سے ابلیسی استعماری نظام کو کوئی خطرہ نہیں۔البتہ روحِ آزادی سے سرشار، انسانیت کو غلامی سے نجات دلانے کے نظریے کے حامل، زر پرستی کے مخالف اور صرف خدائے واحد کی حاکمیت اعلیٰ پر یقین رکھ کر اس کی بادشاہی کے قیام کے لیے کوشاں ہونے والے ہی ابلیسی استعماری نظام کے لیے خطرہ ہیں۔لہٰذا ابلیس یہ حکم جاری کرتا ہے:

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے، قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات
مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اپنے مشیروں کے لیے ابلیس کی یہ حکمت عملی بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اُمت مرحوم کا نوحہ ہے۔(۱۱)

برصغیر کے نوآبادیاتی دور کے ادب کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ نوآبادکاروں کا سیاسی، ثقافتی اور مذہبی غلبہ کس طرح برصغیر کے اجتماعی تعقل و تخیل پر اثر انداز ہوا اور زرخیز روایات کی حامل اس سرزمین کے زرخیز اذہان نے کس طور پر اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ یورپ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے مشرق کے رسیا حکیم الامت اس دور کی ذہنی و فکری کشمکش، پیچیدگی اور اُلجھاؤ کا پیش گوئی کی سطح پر پیمبرانہ اظہار کرتے ہیں:

ع تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

ابلیس نوآبادکاروں کی تہذیب کی مجسم علامت کی حیثیت سے اقبال کی شاعری کا فعال کردار بن جاتا ہے لہٰذا ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' ملت کی مذہبی شناخت کی تجدید اور مغربی تہذیب کے تضادات کا راز فاش کرنے کے حوالے سے اہمیت کی حامل ہے اور اقبال کے لہجے کی بلند آہنگی میں جدیدیت کے رجحان کے زیر اثر ردِاستعماریت کے آثار بھی ملتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) بحوالہ ''برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا'' از مولانا سیّد حسین احمد مدنی، طیب پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۵۵

(۲) ایضاً

(۳) رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اقبال کی طویل نظمیں، فکری و فنی ، مطالعہ سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۲۱۶

(۴) ایڈورڈ سعید، Orientalism، انگلینڈ، پینگوین بکس، ۱۹۹۵ء، ص ۳

(۵) بل اشرافت Post Colonial Studies: The Key Concepts (امریکا، کینیڈا)، روٹلیج، ۲۰۱۳ء، ص ۳۸

(۶) ڈاکٹر سلیم اختر، اقبالیات کے نقوش، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۶

(۷) آل احمد سرور، دانشور اقبال، علی گڑھ ۱۹۹۴ء، ص ۱۴

(۸) بحوالہ ''رودادِ برصغیر'' از شمس القمر قاسمی، لاہور، طیب پبلشرز، ۲۰۰۱ء، ص ۲

(۹) نیر، ڈاکٹر ناصر عباس، اردو ادب کی تشکیلِ جدید، کراچی، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۶ء، ص ۶۴

(۱۰) محمد طاہر فاروقی، سیرتِ اقبال، قومی کتب خانہ، لاہور، ص ۳۰۷

(۱۱) ہاشمی، ڈاکٹر رفیع الدین، اقبال کی طویل نظمیں (فکری و فنی مطالعہ) سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء ص ۲۳۲